دروسِ فقہ

(۲)

(از ڈاکٹر محمد معروف دوالیبی پروفیسر اسلامی قانون لا کالج شام)

اجماع اجماع لغت میں عزم (پختہ ارادہ) کو کہتے ہیں جب کوئی شخص کسی کام کی پختہ اور مستحکم نیت کر لیتا ہے تو کہا جاتا ہے: اَجْمَعَ فُلَانٌ عَلٰی کَذَا (فلاں شخص نے اس کام کا پختہ ارادہ کر لیا)۔ اجماع بمعنی عزم کا استعمال قرآن میں بھی جا بجا ملتا ہے۔ مثلاً فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ (اور تم اپنے ٹھیرائے ہوئے شریکوں کو ساتھ لے کر ایک اٹل فیصلہ کر لو۔ یونس: ۷۱)۔

اجماع کے دوسرے لغوی معنی اتفاق کے ہیں۔ مثلاً جب لوگ مل کر کسی معاملے میں متفق الرائے ہو جاتے ہیں تو کہا جاتا ہے اَجْمَعَ الْقَوْمُ عَلٰی کَذَا (تمام لوگوں نے فلاں معاملے پر اجماع کر لیا یعنی اتفاق کر لیا)۔

ان دونوں معنوں میں فرق یہ ہے کہ اجماع بمعنی عزم کا وقوع ایک فرد سے بھی متصور ہو سکتا ہے لیکن اجماع بمعنی اتفاق دو یا دو سے زیادہ افراد کے بغیر ظہور پذیر نہیں ہو سکتا۔

اصول الفقہ کی اصطلاح میں اجماع کی تعریف یہ ہے:

هُوَ اِتِّفَاقُ الْمُجْتَهِدِيْنَ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ فِيْ عَصْرٍ عَلٰٓى اَمْرٍ مِّنَ الْاُمُوْرِ

مجتہدینِ امت کا کسی دور میں کسی شرعی معاملے میں متفق الرائے ہو جانا۔

جب کوئی ایسا قضیہ درپیش ہو جس کے بارے میں کتاب اللہ یا سنتِ رسول اللہ میں سے کوئی منصوص حکم نہ مل رہا ہو تو ایسی صورت میں خود کتاب و سنت کی رو سے قضیہ زیرِ بحث میں اجماع کو اختیار کیا جائے گا۔ اور اسے کتاب و سنت کے بعد شریعتِ اسلامی کی تیسری اصل قرار دیا جائے گا کتاب اللہ میں ہے: وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ ... اِلٰى مَصِيْرًا (نساء: ۱۱۵)۔ اس آیت میں اجماع کی بنائے

استدلال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سبیل المومنین (اہلِ ایمان کے متفقہ راستہ) سے ہٹ کر دوسرا راستہ اختیار کرنے والے کو عذاب کی دھمکی دی ہے اور اگر سبیل المومنین کا ترک کر دینا ممنوع نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کی شدید وعید نہ ہوتی۔ اسی طرح سنتِ رسول کی واضح ہدایات ہیں:

۱۔ مَنْ خَرَجَ مِنَ الطَّاعَةِ وَفَارَقَ الْجَمَاعَةَ مَاتَ مِيْتَةً جَاهِلِيَّةً — جس نے اطاعت چھوڑ دی اور جماعتِ مسلمین سے علیحدگی اختیار کر لی وہ جاہلیت کی موت مرا۔

۲۔ لَا تَجْتَمِعُ أُمَّتِي عَلَى خَطَأٍ۔ — میری امت غلط بات پر جمع نہیں ہو سکتی۔

کسی حکم شرعی کے ایجاب و اثبات میں کتاب و سنت کی دلیل کو جو قوت اور اہمیت حاصل ہے اجماع کے لیے بھی فقہائے امت نے اسی قوت و اہمیت کو تسلیم کیا ہے[1]۔

اجماع کی اس اہمیت کو اور قانونِ اسلامی میں اس کے ماخذ ثالث ہونے کو دیکھ کر جرمن مستشرق گولڈ زیہر (GOLD ZIHER) انگشت بدنداں ہو کر لکھتا ہے:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ ماخذ قانون — اجماع — قوت کا ایسا منبع اپنے اندر پنہاں رکھتا ہے جو اسلام کو دوامی طور پر متحرک بنائے ہوئے ہے اور اُسے پوری آزادی کے ساتھ تغیر پذیری کی صلاحیت سے بہرہ مند کیے ہوئے ہیں۔ یہی وہ سرچشمہ ہے جو شخصی استبداد اور بے روح اقتدار کے غرور کا تیر بہدف علاج مہیا کرتا ہے"

اقسامِ اجماع اجماع کے وقوع کی چار صورتیں ہیں:

۱۔ مجتہدینِ امت نے کسی ایک رائے پر اتفاق کر لیا ہو۔ اسے اجماعِ قولی کہتے ہیں۔

۲۔ کسی معاملے میں امت کا متفقہ تعامل چلا آرہا ہو اسے اجماعِ عملی کہتے ہیں

۳۔ بعض اہلِ فتویٰ نے کسی مسئلے میں رائے بیان کی ہو جس پر باقی اہلِ فتویٰ مطلع ہونے کے بعد خاموش رہے ہوں۔

۴۔ چند اہلِ فتویٰ کا کسی معاملے پر تعامل ہو، جس پر باقی اہلِ فتویٰ نے مطلع ہونے کے باوجود کوئی

[1] کشف الاسرار لعبدالعزیز البخاری شرح اصول البزدوی۔ جزء ثالث ص ۲۲۷۔

اعتراض یا تنقید نہ کی ہو۔

اجتہاد اجتہاد کا لغوی مفہوم یہ ہے: کسی کام کو سرانجام دینے میں پوری قوت صرف کر دینا۔ اسی لیے عربی میں لفظ اجتہاد کا استعمال ایسے کاموں کے لیے کرتے ہیں جو محنت اور مشقت سے انجام پاتے ہوں مثلاً یہ تو کہا جائے گا: فُلَانٌ اِجْتَهَدَ فِي حَمْلِ الرَّحٰى (فلاں شخص نے چکی اٹھانے میں پوری قوت صرف کر دی)۔ لیکن یہ نہیں کہا جائے گا کہ: فُلَانٌ اِجْتَهَدَ فِي حَمْلِ خَرْدَلَةٍ اَوْ نَوَاةٍ (فلاں نے رائی کے دانہ کو یا گٹھلی کو اٹھانے میں پوری طاقت صرف کر دی)۔

اہلِ اصول اجتہاد کی تعریف یہ کرتے ہیں:

بَذْلُ الْجُهْدِ فِي اسْتِخْرَاجِ الْاَحْكَامِ مِنْ شَوَاهِدِهَا، اَلدَّالَّةِ عَلَيْهَا بِالنَّظْرِ الْمُؤَدِّي اِلَيْهَا۔

کتاب و سنت کے ایسے شواہد سے، جن میں نئے احکام کے لیے رہنمائی موجود ہو، انتہائی کوشش اور گہری بصیرت کے ساتھ نئے احکام کا استنباط کرنا۔

کتاب اللہ، سنتِ رسولؐ اور اجماع سے جب کسی زیرِ بحث مسئلے میں حکم فراہم نہ ہو رہا ہو، تو اجتہاد کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ اور جیسا کہ پیچھے گذر چکا ہے، ایسی صورت میں خود کتاب و سنت اجتہاد کو قانونِ اسلامی کی اصلِ رابع قرار دیتے ہیں۔ کتاب اللہ کے ان ارشادات سے اس کا ثبوت ملتا ہے: (۱) اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (۲) كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ (۳) كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ۔ سنتِ رسول میں اس کا جامع ثبوت حضرت معاذ بن جبل کی حدیث میں موجود ہے، جس میں آتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب معاذ بن جبل کو یمن کا قاضی بنا کر بھیجا تو آپؐ نے اُن سے دریافت فرمایا: بِمَ تَقْضِيْ؟ (تم فیصلے کس طرح کرو گے؟)۔ معاذ نے کہا: بِمَا فِي كِتَابِ اللّٰهِ؟ (کتاب اللہ کے مطابق)۔ آپؐ نے فرمایا: فَاِنْ لَمْ تَجِدْ فِي كِتَابِ اللّٰهِ؟ (اگر کتاب اللہ سے تمہیں ہدایت نہ ملے تو کیا کرو گے؟) معاذ نے کہا: اَقْضِيْ بِمَا قَضٰى بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ (رسولِ خدا کے فیصلوں کو دارومدار بناؤں گا)۔ آپؐ نے فرمایا: فَاِنْ لَمْ تَجِدْ فِيْمَا قَضٰى بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ (رسولِ خدا کے فیصلوں سے بھی اگر تم کو رہنمائی نہ

ملے گی تو کونسا طریقہ اختیار کروگے؟ معاذؓ نے کہا: اَجْتَهِدُ بِرَأْيِي (اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا)۔ چنانچہ حضرت معاذؓ کے اس جواب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي وَفَّقَ رَسُوْلَ رَسُوْلِهٖ (اللہ کا شکر ہے جس نے اپنے رسول کے نمائندے کو راست روی کی توفیق دی)

مذکورہ آیاتِ قرآنی سے اور حدیثِ معاذ سے واضح ہوتا ہے کہ اس اصل رابع کے متعدد نام ہیں (۱) اجتہاد (۲) رائے (۳) تعقل (۴) اس کا ایک نام قیاس بھی ہے، یہ نام حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کے نام اپنے ایک مکتوب میں استعمال کیا ہے، آپ نے ابو موسیٰ اشعری کو لکھا تھا: اَلْفَهْمَ اَلْفَهْمَ فِيْمَا تَلْجْلَجَ فِيْ صَدْرِكَ مِمَّا لَيْسَ فِي كِتَابٍ وَّلَا سُنَّةٍ، اِعْرِفِ الْاَشْبَاهَ وَالْاَمْثَالَ وَقِسِ الْاُمُوْرَ عِنْدَ ذَالِكَ (جو حکم تم کو کتاب و سنت میں نہ ملے اور اس کے متعلق تمہارے دل میں کھٹک ہو تو خوب غور سے کام لو اور کتاب و سنت میں اس کے مماثل و مشابہ احکام دریافت کرو اور پھر ان پر قیاس کرو۔)

مَیں نے ان چاروں اسماء میں سے صرف لفظ "اجتہاد" اختیار کیا ہے، کیونکہ یہ لفظ ان تمام الفاظ سے جامع ہے اور اس میں باقی تینوں کلمات کا مفہوم شامل ہے۔

اجتہاد صرف شخصی اور انفرادی رائے کا نام ہے جس پر تمام مجتہدین کا اتفاق نہ پایا جاتا ہو۔ کیونکہ اگر تمام مجتہدین کسی اجتہاد پر اتفاق کریں تو وہ اجتہاد سے آگے بڑھ کر اجماع قرار پا جائے گا۔ اور اجماع اجتہاد سے زیادہ قوی الحکم ہوتا ہے اور درجہ کے لحاظ سے بھی اجتہاد اجماع سے مؤخر ہے

اجتہاد کا دائرہ اور روح دائرۂ اجتہاد میں صرف وہی امور شامل ہیں جن کے بارے میں کتاب و سنت خاموش ہوں۔ مجتہد کا کام یہ ہے کہ وہ ایسے امور کا حکم شرعی دریافت کرنے کے لیے کتاب و سنت میں غواصی کرے اور ان سرچشموں میں سے ایسے احکام کی جستجو کرے جو غیر منصوص احکام سے مشابہت و مماثلت رکھتے ہوں اور پھر انہی احکام پر قیاس کر کے نئے احکام پر حکم شرعی لگائے (جیسا کہ حضرت عمرؓ کے مذکورہ خط میں اس کی تفصیلات موجود ہیں)۔ گویا مجتہد کی یہ تمام تر کد و کاوش قرآن کے "نور" اور سنت کی "ہدایت" تک پہنچنے کی خاطر ہوتی ہے۔ یا آپ چاہیں تو ان دونوں

کلموں (نور و ہدایت) کو "روحِ شریعت" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ یہی روح ہمیشہ سے مجتہدینِ امت کے قلب و نظر کی زینت بنی رہی ہے۔ اور اس سے مراد یہ ہوتی تھی کہ:

۱۔ مصلحت ہی دراصل منشائے شریعت ہے

۲۔ مصلحت کا جو تقاضا ہوگا شریعت کا حکم اُسی کے مطابق ہوگا۔

۳۔ ایسے عمل کا اور حکم کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں جس میں عدل کے بجائے جور، رحمت کے بجائے زحمت، اصلاح کے بجائے فساد اور حکمت کے بجائے فضولیت پائی جاتی ہو۔

جرمن مستشرق اجماع کو شریعتِ اسلامی کا ماخذ قانون دیکھ کر بالکل بجا متعجب ہوا ہے اور اُسنے بجا طور پر اسلام کی قوتِ محرکہ اور منبعِ ارتقا قرار دیا ہے لیکن اُسے معلوم ہونا چاہیے کہ اجتہاد کو بھی شریعتِ اسلامی نے قانون کا ماخذ تسلیم کر کے اسلام کے نظامِ قانون میں ایک ایسی "قوتِ بصیرت" ودیعت کر دی ہے جو اس کی نشوونما اور ترقی کی ضامن ہے اور جو ہر دور میں قواعدِ شریعت پر بانجھ پن اور نارسائیدگی کے الزامات کو اور مزاجِ شریعت پر جمود کی تہمت کو زائل کرتی رہے گی۔

اسلام سے قبل جزیرہ عرب کی اقتصادی حالت

قانون زندگی کا آئینہ ہے ہر قوم کا قانون اس قوم کی ضروریات کے تحت جنم لیتا ہے۔ اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ کسی قوم کا قانونی نظام اس قوم کے معیارِ زیست کا حقیقی مصور ہوتا ہے۔ یعنی اس کے لوازمِ زندگی کا صحیح آئینہ اُس کی اقتصادی سطح کا حقیقی عکس اور اُس کے تصوراتِ حقوق کا درست معیار ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ اسلام کے دورِ اول کے مصادرِ تشریع اور اصولِ تفقہ و استنباط پر کلام کرنے سے قبل ہم یہاں عربوں کی قبل از اسلام اقتصادی صورتِ حال کا کسی حد تک جائزہ لے لیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ اُس معاشرے کی طبیعت و ساخت کس نوعیت کی تھی جس میں اسلامی قانون قاضی بن کر آیا تھا اور جس کی تنظیم و تدبیر کا اُس نے بیڑا اٹھایا تھا؟

اِس نقطۂ نظر سے جب ہم اسلامی قانون کا مطالعہ کرتے ہیں اور اجتماعی و انفرادی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے بارے میں اسکے ذخیرۂ احکام پر نظر ڈالتے ہیں تو ہماری نگاہوں کے سامنے عربوں کی ایک ایسی حیاتِ اقتصادی عکس ریز ہوتی ہے جس میں قطعاً کوئی ایسی علامت نہیں دکھائی دیتی جس کی بنا پر ہم یہ حکم لگا سکیں کہ یہ دنیا سے الگ تھلگ اور بے تعلق اقتصادی زندگی ہے یا یہ ابھی ابتدائی مراحل عبور کر رہی ہے اور شیر خوارگی کا زمانہ گذار رہی ہے۔ بلکہ معاملہ اس کے برعکس معلوم ہوتا ہے۔ اس کا بنیادی سبب جزیرۂ عرب کی جغرافیائی ہیئت ہے۔ جس نے جزیرۂ عرب کو عالمِ قدیم کے تینوں براعظموں (ایشیا۔ افریقہ۔ یورپ) کا نقطۂ اتصال بنا رکھا تھا۔ بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اُسے تینوں براعظموں کے مابین سامانِ تجارت کی نقل و حمل کی واحد شاہراہ کی حیثیت دے رکھی تھی۔

جزیرہ نمائے عرب کی جغرافیائی حیثیت جزیرہ نمائے عرب ایشیا ہی کا ایک حصہ تھا جس کا بیشتر حصہ صحراؤں کی گود میں تھا۔ تین اطراف سے سمندروں میں گھرا ہوا تھا: سمتِ مغرب میں بحرِ احمر، جنوب میں بحرِ ہند اور سمتِ مشرق میں بحرِ عمان، خلیج فارس اور دجلہ کا کچھ حصہ۔ سمتِ شمال کی حدود متعین و معلوم نہ تھیں لیکن اندازے کے مطابق وہ غزہ (فلسطین) سے شروع ہوتی تھیں اور بحرِ ابیض کے سواحل سے بحرِ مردار تک پھیلی ہوئی تھیں اور بحرِ مردار سے دمشق تک اور دمشق سے فرات تک کے درمیانی خطوط کو محیط تھیں۔ اس جغرافیائی محلِ وقوع کو سامنے رکھ کر اگر جزیرہ عرب کی مشرقی اور مغربی حدود کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ جزیرۂ عرب افریقہ اور ایشیا کے مابین ایک سنگم کی حیثیت رکھتا ہے۔

جزیرہ نمائے عرب کا طول تقریباً ۲½ ہزار کیلو میٹر اور عرض ۱ ہزار کیلو میٹر کے لگ بھگ تھا۔ رقبے کے بارے میں صحیح تخمینہ یہ ہے کہ ۳۰ لاکھ مربع کیلو میٹر سے متجاوز تھا۔ یہ وسیع و عریض علاقہ کچھ بے آب و گیاہ ریگستانوں اور کچھ آباد اور قابلِ کاشت اراضی پر مشتمل تھا۔ دوسرے حصہ میں بعض جگہ وادیاں تھیں بعض جگہ پہاڑیاں تھیں جن میں بعض کی بلندی ۱½ ہزار میٹر تک تھی۔ ان وادیوں اور پہاڑ کے دامنوں میں زیادہ تر کاشت کار طبقے قصبوں اور قریوں کی صورت میں آباد تھے۔ اندازہ ہے کہ

ملک کا نصف حصہ بنجر اور نصف قابلِ زراعت تھا۔ قابلِ کاشت حصوں میں ایک یمن تھا جو اپنی زرخیزی و شادابی میں ضرب المثل تھا اور دوسرا نجد تھا جو خاک کی عمدگی اور ہوا کی خوشگواری میں غیر معمولی شہرت رکھتا تھا چونکہ بعض حصوں کی آب و ہوا گرم اور بعض کی معتدل ہے، اس لیے آب و ہوا کا اختلاف ملک کی زرعی پیداوار پر بہت بڑا اثر رکھتا تھا۔ اور اس نے عرب منڈیوں کو اس لحاظ سے جامع حیثیت دے دی تھی کہ اُن میں گرم علاقوں کی زرعی پیداوار اور معتدل علاقوں کی زرعی پیداوار کی قسمیں یکجا مہیا ہو سکتی تھیں۔

جزیرہ نمائے عرب کی تمدنی تاریخ | یمن کے بارے میں ہنری ماسی (H-MASSE) لکھتا ہے:

یمن جس سے میری مراد عرب کا جنوبی علاقہ ہے اور جسے "بلادِ سعیدہ" کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ ہر دور میں اپنی زرخیزی اور فرطِ ثروت میں مشہور رہا ہے۔ اس کے کھنڈر اس کے شاندار ماضی کی منہ بولتی تصویریں ہیں۔" گوستاف لیبان "تمدنِ عرب" میں لکھتا ہے:

"ہیروڈوٹ (HEYODOTE) نے چار سو سال قبل مسیح بلادِ سعیدہ یعنی یمن کے بارے میں ہم سے جو رائے بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کرۂ ارض کے خوش حال ترین خطے کا ذکر کر رہا ہے۔ توراۃ میں مآرب کا ذکر آتا ہے، یہ قومِ سبا کا تاریخی شہر ہے۔ اس شہر کے محلات عظمت و ثروت کا نقطۂ انتہا تھے۔ ان کے دروازے کُندن کے بنے ہوئے تھے۔ زرّیں و سیمیں ظروف سے پٹے رہتے تھے۔ ہر طرف نفیس معدنیات سے تیار شدہ آرام دہ تخت بچھے رہتے تھے۔"

عمان کے متعلق ہنری ماسی لکھتا ہے:

"جزیرۂ عرب کا جنوب مشرقی منطقہ عمان بھی پہاڑی علاقہ ہے اور نہایت شاداب ہے۔ اس کے سواحل بندرگاہوں سے بھرے ہوئے ہیں۔ انہی بندرگاہوں سے عرب جہاز ران دنیا کے کونے کونے تک تاخت کرتے رہے ہیں اور جہاز رانی کی تاریخ میں اپنا نام روشن کر گئے ہیں اور آج مسقط کو وہی مقام حاصل ہے جو قدیم دارالحکومت سحر جیسے

بعض عرب جغرافیہ دان باب چین کے نام سے موسوم کرتے ہیں، کو حاصل تھا۔

ہنری ملیس مزید لکھتا ہے:

"بحرین خلیج فارس کے طول پر پھیلا ہوا ہے۔ یہ وہی علاقہ ہے جسے "سرزمین جواہر و یواقیت" کہا جاتا ہے۔ اور جس کی کھجور کی پیداوار دنیا بھر میں ضرب المثل بن چکی ہے۔"

ان تفصیلات سے دو نتائج ماخوذ ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ یہ درست نہ ہوگا کہ ہم جزیرۂ عرب کے آباد یا بنجر حصّوں میں سے کسی ایک حصّے کو پیشِ نظر رکھ کر جزوی طور پر جزیرۂ عرب کی اقتصادیات کے بارے میں رائے قائم کریں۔ کیونکہ اس سے صحیح اندازہ سامنے نہیں آسکتا۔ اور دوسرا یہ کہ زرخیزی اور ریگزاری کے لحاظ سے جزیرۂ عرب کے بعض حصّوں کا بعض دوسرے حصّوں سے اس قدر عظیم تفاوت رکھنا ہی دراصل وہ بنیادی عامل تھا جو قبائل عرب میں وقتاً فوقتاً عداوت و مخاصمت کی آگ بھڑکاتا رہتا تھا اور ہر قبیلے کو مجبور کرتا رہتا ہے کہ اُسے دوسروں سے بڑھ کر زرخیز و خوشحال حصّوں پر تسلّط حاصل رہنا چاہیے۔

جغرافیائی محلِ وقوع کا اثر اقتصادیات پر حقیقت یہ ہے کہ جزیرہ نمائے عرب کے اس عجیب و غریب جغرافیائی محلِ وقوع نے جزیرۂ عرب کی منڈیوں کو ایک ایسا جنکشن بنا دیا تھا جو ہندوستان، ایران، بابل، حبشہ، شام اور فلسطین کے مابین سلسلۂ مواصلات قائم کیے ہوئے تھا۔ اور اس پر مستزاد یہ کہ وہ باہمی آویزشیں اور لاتناہی جنگیں جو قدیم زمانے سے ایک طرف ایران اور مصر کے درمیان، دوسری طرف ایران اور یونان کے درمیان اور تیسری طرف ایران اور روم کے درمیان برپا چلی آرہی تھیں اور ظہورِ اسلام تک ان کا سلسلہ جاری تھا، جزیرۂ عرب کی مرکزی اہمیت میں اضافہ کرنے کا موجب ہوئیں۔ کیونکہ ان ممالک کی باہمی عداوتوں کی وجہ سے کوئی تجارتی شاہراہ محفوظ نہ رہی تھی۔ صرف جزیرۂ عرب ہی وہ واحد تجارتی شاہراہ تھا جسے ہر ملک اپنے لیے پُرامن اور آزاد پا سکتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عرب کے تمام بڑے بڑے شہر دنیا بھر کی واحد تجارتی منڈی بن گئے۔ اور اہلِ عرب بالعموم اور قریشِ مکہ بالخصوص اپنے اس احترام و عزت کی بنا پر جو تمام عرب میں انہیں حاصل تھا، تجارتی کاروبار

کے سب سے بڑے ایجنٹ قرار پاگئے تھے۔ عربوں کے قافلے ان منڈیوں میں ہر طرح کا مال بہم پہنچاتے جس میں جانوروں کی کھالوں سے لے کر گراں قدر معدنیات، نفیس عطریات، ہر طرح کی رنگی سونے کے توڑے، افریقی ہاتھی دانت اور چین کے ریشمی لباس تک شامل ہوتے تھے۔

وسیع الاثر تجارتی تعلقات پر مؤرخین کے بیانات | گستاف لیبان لکھتا ہے:

"یمن کے بڑے بڑے شہروں کا حسن جمال اور خوشحالی اُس کے انتہائی قدیم اور انتہائی وسیع تعلقات کا نتیجہ تھی۔ عربوں کے تعلقات اس قدر وسیع تھے کہ تمام قدیم دنیا کی سرحدوں کو چھو رہے تھے۔ اور ان کی ابتداء اس قدر پرانی ہے کہ توراۃ میں بھی ان کا ذکر ملتا ہے"

موصوف آگے چل کر لکھتا ہے:

"یمن کے بڑے بڑے شہر دو ہزار سال سے زائد عرصہ تک تمام دنیا کا بلا اختلاف مرکز تجارت بنے رہے ہیں اور انہوں نے اپنے دور میں وہی پارٹ ادا کیا ہے جو شہر بندقیہ نے اپنے عہد زریں میں ادا کیا تھا"

"یورپ نے اپنے عہد قدیم میں عربوں ہی کے ذریعہ سے ایشیا کے دور دراز ممالک سے تعلقات قائم کیے ہیں۔ اور یہ بھی واضح ہے کہ عربوں کی تجارت صرف عرب مصنوعات و اشیاء تک محدود نہ تھی بلکہ افریقہ اور ہندوستان سے درآمد کردہ سامان بھی ان کی تجارت کا جزو تھا"

"ان مسلسل اور قدیم تجارتی تعلقات کے آئینے میں ہمارے لیے جزیرۂ عرب کے بڑے بڑے شہروں کی اقتصادی حیثیت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ وہ قدیم العہد تجارتوں کی وجہ سے شانِ بے نیازی رکھتے تھے اور ہر قسم کے نفیس اور خوشنما سازو سامان سے بخوبی شناسا تھے۔ یہی وہ حقیقت ہے جو اس گتھی کو سلجھانے میں ہمیں مدد دیتی ہے کہ عرب مؤرخین کے علاوہ یونان اور روم کے مؤرخین بھی کیوں بالاتفاق ان شہروں کی عظمت و وسعت پر حیرت زدہ ہیں"

"محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے قبل عربی تمدن کی چمک دمک صرف یمن تک ہی محدود نہ تھی، بلکہ تاریخ قدیم ہمارے سامنے حیرہ اور غسان کی مملکتوں کے بارے میں بھی جو تمدنی تفصیلات پیش کرتی ہے، اُن سے ہمیں ایسے قطعی دلائل فراہم ہو جاتے ہیں جن کی روشنی میں ہم بخوبی اُس استعداد اور صلاحیت کی مقدار معلوم کر سکتے ہیں جو تلامذۂ محمد کے اندر مستقبل کے روشن تمدن کو اخذ کر لینے کے لیے پائی جاتی تھی۔"

اقتصادی ترقی کے دو اور اسباب ساتویں صدی عیسوی کے آغاز میں ایران اور روم کی طویل باہمی جنگجوئیوں نے مکہ کی تجارتی سرگرمیوں کو مزید تیز کر دیا تھا۔ قریش کا شہر مکہ — جو پہلے ہی غیر معمولی اہمیت رکھتا تھا ان جنگی حالات کے نتیجے میں اب وہ ایک ایسے چوراہے میں واقع ہو گیا تھا جہاں سے مشرق اور بحر ابیض، اور افریقہ اور سوریہ کی جانب تجارتی شاہراہیں نکلتی تھیں۔ علاوہ ازیں اس شہر میں عکاظ، مجنہ، ذوالمجاز اور اسی نوعیت کے دوسرے موسمی بازاروں اور منڈیوں کا تانتا بندھا رہتا تھا جو اس کی مقامی تجارت کو مہمیز لگاتا رہتا تھا۔ حج کا اجتماع بھی بے شمار تجارتی فوائد رکھتا تھا۔ عربوں کے نزدیک حج اور تجارت اور دین اور دنیاوی منافع باہم غیر منفک ربط رکھتے تھے۔"

ہمہ گیر تجارتی سفر عربوں کے چھوٹے چھوٹے تجارتی قافلوں کے علاوہ قریش کے دو بہت بڑے معمول کے تجارتی سفر تھے: ایک موسم گرما میں یمن کی جانب اور دوسرا موسم سرما میں شام کی جانب ہوتا تھا۔ یہ دونوں سفر ایک ایسا قومی اور اجتماعی ادارہ بن چکے تھے جس نے ہر فرد کو اپنے ساتھ وابستہ کر رکھا تھا۔ دراصل ان سفروں کی ہمہ گیری قریش کے اس محکم اور مضبوط مالی فارمولے کی بنا پر تھی جس کی رُو سے ہر چھوٹے سے چھوٹا سرمایہ دار اپنی کم سے کم مقدار میں پونجی شامل کر کے اس ادارے کا ممبر بن سکتا تھا۔ یہ تجارتی سفر اپنے حصہ داروں کو پچاس فیصد منافع لازماً لوٹاتے تھے بلکہ بعض اوقات صد فی صد۔

خلاصۂ بحث قبل از اسلام جزیرۂ عرب کی اقتصادی پوزیشن معلوم کرنے کے لیے اسی قدر اشارات کافی ہیں۔ ان اشارات سے یہ امر صاف واضح ہے کہ عرب سوسائٹی جو اپنی تجارتی زندگی میں اپنے

خارجی تعلقات میں اور اپنی اکانومی میں اس درجہ ترقی پر تھی وہ اسلام کی آمد سے بہت عرصہ پیشتر ان حدود سے کافی آگے نکل چکی تھی جو دنیا سے الگ تھلگ ملک، سادہ و ابتدائی قوم اور اقتصادی پیداوار میں کسی کم سن معاشرے کے لیے سمجھی جاتی ہیں۔

ہمارے اس خیال کی تائید میں ہنری لیمنس رقمطراز ہے:

"ہمیں یہ تکرار کہنے میں کوئی باک نہیں محسوس ہوتا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعوت کا روئے سخن ایک ایسی جماعت کی جانب تھا جو زمانہ دراز سے گوشۂ عزلت ترک کر چکی تھی ۔ ۔ ۔ اس وقت مکہ سرمایہ داروں اور تاجروں کے ایک بڑے گروہ کا مرکز تھا جن میں سے ہر ایک حساب دان اور ہر ایک محاسب تھا۔ یہ فضیلت انہیں عرب کے قابل احترام خاندان قریش سے نسبت رکھنے کی بنا پر تھی"

اوپر کی تمام بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ

(الف) اسلام سے قبل عرب قوم اقتصادی لحاظ سے دنیا سے بے تعلق نہیں تھی۔

(ب) بلکہ وہ یونان و روم سے بھی ہزارہا سال قبل گوشۂ عزلت سے نکل چکی تھی اور اقتصادیات میں اس مقام پر پہنچ چکی تھی جو طفولیت کے مقام سے بہت آگے ہوتا ہے۔

(ج) اس معاشرے پر اسلام نے مختلف پہلوؤں میں جو قوانین نافذ کیے ہیں وہ اس معاشرے کی صحیح تصویر پیش کرتے ہیں اور ان قوانین کی حیرت انگیز تفصیلات اور متنوع تصریحات بھی اس بات کی کھلی دلیل ہیں کہ ان قوانین کا لباس جس معاشرے کے لیے تراشا گیا ہے اس میں عزلت و خمول کی کوئی علامت نہیں بلکہ اُس کی اقتصادیات ترقی یافتہ اور اس کے خارجی روابط وسیع الاثر ہیں۔